سلطانہ کا خواب

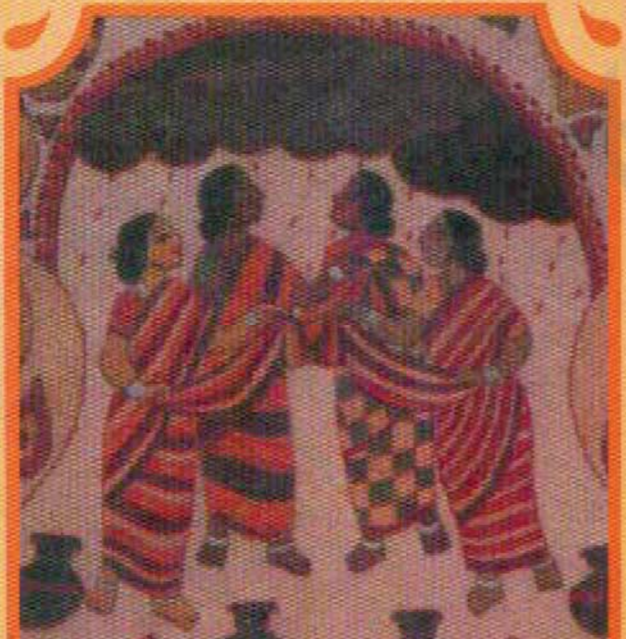

رقیہ سخاوت حسین
ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا

مشعل

سلطانہ کا خواب

رقیہ سخاوت حسین

ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

مشعل

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور ۵۴۶۰۰، پاکستان

MashalBooks.org

سلطانہ کا خواب

رقیہ سخاوت حسین

ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

کاپی رائٹ © اردو۔۱۹۹۹ مشعل
کاپی رائٹ © انگریزی ۱۹۹۸، بنگلہ اکیڈمی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

ناشر: مشعل
آر بی ۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور ۵۴۶۰۰، پاکستان
فون و فیکس 042-35866859
E-mail:mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

پیش لفظ

برسوں پہلے رقیہ سخاوت حسین نے جنوب ایشیا کی مسلمان عورتوں اوران کی زندگی کے بارے میں جو کچھ اور سوچا تھا، آج وہ صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جس دنیا میں عورتیں رہتی ہیں، اس کی پہچان اوراس سے واقفیت کی خاطر رقیہ نے جو دریچے کھولنا چاہے تھے، اور جن حقیقتوں سے پردہ اٹھانا چاہا تھا، وہ آج کی خواہشوں اور آرزوؤں کی فہرست میں بھی شامل ہیں۔ انصاف کی طلب میں عورت بڑی لمبی مسافت طے کر چکی ہے، مگر اس کے مقام اور منزل کا تعین آج بھی بے یقینی کا شکار ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ خود عورتوں کا شکست خوردہ رویہ یا مردوں کے رویوں میں عدم تحفظ کا عمل دخل...... قطعی فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ بظاہر دونوں امکان ہی موجودہ تہذیبی صورت حال کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عورتوں نے اپنی زندگی کی پابندیوں کے باوجود اپنی زندگی تشکیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعے معاش کے وسیلوں تک اپنی محنت اور لیاقت سے رسائی حاصل کی، لیکن معاشرے میں جو اعتبار اور یقین ان کا حصہ تھا، وہ ابھی تک اس کا مقدر نہیں ہوا۔ اس بات کی وضاحت یہاں بہت ضروری ہے کہ تمثال بیان کی خاطر ایک اچھا حوالہ ہو، لیکن عورتیں، دنیا کو زنانہ اور مردانہ کی تقسیم میں نہ تو دیکھنا چاہتی ہیں اور نہ بنانا چاہتی ہیں۔ پروردگار نے یہ دنیا انسانوں کے لئے بنائی ہے اور عورتیں، بحثیت انسان اپنا تعارف، حق اور مقام طلب کرتی ہیں۔ یہ ایسی ناروا بات نہیں، جس کے لئے انصاف نہ کیا جا سکے اور عورتوں کو انسان کا مساوی درجہ دینے میں کوئی قباحت پیدا ہوتی ہے۔

جنوبی ایشیا کی مسلمان عورتیں، تہذیبی ٹکراؤ کی وجہ سے ان روایتوں کی پابند کی گئیں جو ہمارے عقیدے اور فلسفہ اخلاق سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مردوں

کے محکوم معاشرے کو یہ فضا راس آتی گئی اور آخر روایت اور حقیقت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا اور اصول پر رواج غالب ہوتا گیا۔ رقیہ سخاوت حسین نے اس تجزیے کی ابتدا کی تھی کہ تہذیبی رویوں کو چھان پھٹک کر دیکھا جائے تا کہ معاشرتی مفاہمت ہموار ہو سکے اور برتر اور بدتر کا وہم اور خوف، زندگی کو زنگ نہ لگا سکتے۔ معاشرتی بے چینی، ترقی کی رکاوٹ بنتی ہے اور ترجیحات غیر مرتب ہو کر ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کی صورت حال کو بے ترتیب کر دیتی ہیں۔

عورتوں کی زندگی معاشرے کی مجموعہ زندگی سے الگ اور تنہا نہیں ہے۔ اگر معاشرے کی تکمیل منظور ہے تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ یقین اور اعتبار کے ساتھ کاروبار زندگی میں شریک ہو سکتے ہیں کہ ایک دوسرے سے شکایت اور بے اعتباری کا موقعہ ہی پیدا نہ ہو۔

یہ امید آج بھی زندہ ہے بے تاب ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کی صلاحیتیں، معاشرے کی تعمیر اور ترقی کے لئے بروئے کار ہو سکیں۔ اگر ہمارے اندر متوازن ترقی پانے کی خواہش شدید ہے تو انصاف کو بھی معاشرتی سطح پر توازن کے ساتھ عام کرنا ہو گا اور اس وقت رقیہ سخاوت حسین کے خواب تعبیر پا سکیں گے اور ان کی زندگی بھر کی کوششیں بار آور ہو سکیں گے۔

عارفہ سیدہ

لاہور

دیباچہ

اس کتاب میں ہم پردے....... عورتوں کی علیحدگی اور ''عزلت نشینی'' کو تین لوگوں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ایک تو بیسویں صدی کے اوائل کی مسلمان مصنف کی نظر سے، جو پردے کی واقف حال تھی اور جس کے خلاف انہوں نے زندگی بھر مہم جاری رکھی۔ دوسرے آج کی ایک بنگلہ دیشی عورتوں کے حقوق کی علمبردار مصنف اور تیسرے شمالی امریکہ کی ایک نسائیت کے حق میں نعرہ زن سوشل سائنٹسٹ کی نظر سے جو جنوبی ایشیا اور پردے دونوں کی واقف حال ہیں۔

یہ بات انتہائی اہم ہے کہ رقیہ سخاوت حسین کو وسیع پیانے پر متعارف کرایا جائے۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کے خیالات اہم ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کی مختصر کہانی ''سلطانہ کا خواب'' عورتوں کی افلاطونی دنیا کا قصہ ہے۔ یہ تحریر نسائیت کی مشہور علمبردار شارلٹ پرکنز گل مین کے ناول ''ہرلینڈ'' سے بھی دس برس پہلے لکھی گئی۔ ان حساس خاتون کو، جو عورتوں کے حقوق میں آواز اٹھانے والی پہلی مصنف ہیں، زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں کے لئے میسر کرنا، غفلت کی طویل مدت کی تلافی کے لئے ہے۔ یہ بات بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ نسائیت کا احساس، اپنے ملک سے بھی جنم لے سکتا ہے اور اس کے لئے غیر ملکی رسوخ پر تکیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم اس کتاب کو تین طرح کے پڑھنے والوں کے لئے سودمند سمجھتے ہیں۔ ان استادوں اور طالب علموں کے لئے جو ایسے ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں جس کا موضوع اور مصنف عورت ہے۔ یہاں ایک نسبتاً کم معروف ایشیائی مصنف کا پس منظر کے حوالے سے تعارف منظور ہے۔ ایشیائی ادب اور زندگی کا مطالعہ کرنے والے، ان استادوں اور طالب علموں کے لئے جو ایشیا میں نہیں رہتے یہاں اضافہ یہ ہے کہ عورتوں کے تجربے کو نمایاں کیا جائے، جو اکثر نظر انداز کیا جاتا

MashalBooks.org

ہے۔ایشیا میں رہنے والے پڑھنے والوں کے لئے، ایک ایسی مصنف کا تعارف، بنگال کی ثقافت اور بنگالی زبان کے دائرہ کار سے باہر زیادہ متعارف نہیں ہے۔ مگر جس کا تجربہ جنوبی ایشیا کی تہذیب کی گونج لئے ہوئے ہے۔

تینوں طرح کے پڑھنے والوں کے لئے، تاریخ کا احساس بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ پردے کی پابندی زمان ومکان کے لحاظ سے یکساں نہیں رہی۔ سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں سے عورتوں کی زندگیاں غیر متوقع تیز رفتاری سے اثر پذیر ہوتی ہیں اور یہ اثر ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ ''عزلت نشین'' میں رقیہ نے جن پردہ دار خواتین کا ذکر کیا ہے، اسے اس پس منظر میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہے کہ جنوبی ایشیا میں خود پردے کے رواج میں تیزی سے تبدیلی آتی رہی ہے۔ اس کی پابندی میں اختلاف اور تفریق بھی رہی ہے، صرف مختلف علاقوں کی ثقافتوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسی معاشرے کے علاقائی اور طبقاتی فرق کی وجہ سے بھی نوعیت بدلتی رہی ہے۔ حالات کا عجب طنز یہ ہے کہ رقیہ نے پردے کی جس سخت پابندی کا ذکر اس صدی کے شروع کے حوالے سے کیا ہے وہ شاید بہت سے پڑھنے والوں کے لئے ناقابل یقین ہو، لیکن جن علاقوں میں پردہ کا سوال پھر سے متحرک ہو رہا ہے، وہاں کے رہنے والوں کے لئے اس کا تسلیم کر لینا عین ممکن ہے۔

''سلطانہ کا خواب'' ''ایک افسانہ'' ''عزلت نشین'' ایک سچی رپورٹنگ۔ یہ تحریریں ان دو صنفوں کی عکاس ہیں، جنہیں رقیہ نے اختیار کیا اور جو اس بات کا مظہر ہیں کہ رقیہ کی توجہ کا مرکز عورتوں کے ساتھ کی جانے والی بے انصافی تھی۔ ''سلطانہ کا خواب'' پردے کی کایا کلپ میں روشن جہاں نے رقیہ کے نئے پڑھنے والوں کے لئے یہ تعارف مہیا کر دیا ہے کہ رقیہ نے یہ کہانی کیونکر لکھی اور انگریزی میں لکھنے کی وجہ کیا تھی۔ انہوں نے کہانی کی ادبی وضاحت بھی پیش کر دی ہے۔ اسی طرح ''عزلت نشین: پردے کی پابندی'' میں جہاں نے پردے کے متعلق لکھی جانے والی دوسری عصری تحریروں کے مقابلے میں ان رپورٹوں کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ''رقیہ: ان کی زندگی

کا تعارف'' میں جہان نے ایک وسیع پیمانے پر رقیہ کی زندگی کو دیکھا ہے۔ اس میں ان کی دوسری تحریریں، خیالات اور نسائیت کے تصور کا بھی احاطہ ہے اور آخر میں اپنے پس حرف: ''شہیر کو مقید کرنا..... ہمارے عہد کی کہانی'' میں حنا پاپنیک پردے کو ایک وسیع تر کینوس پر دیکھتی ہیں۔ صرف پردہ کرنے کی رسموں میں جتنا تنوع پایا جاتا ہے، اسی پر نظر نہیں کی گئی، بلکہ پردے کا تصور جنوبی ایشیا کے باہر رہنے والوں کے فیصلوں پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جنوبی ایشیا میں پردے سے متعلق پاپنیک کے اپنے مشاہدات میں وہ اقتباس بھی شامل ہیں، جہاں ایک خاتون نے اپنے شوہر کی خاطر بڑی بے دلی سے پردہ چھوڑا۔ پس حرف میں پاپنیک نے ان مخفی قوتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر سماجی اختیار، جنسیت اور تولیدی صلاحیت..... جوان معاشروں میں عورتوں اور مردوں کے تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہیں، جہاں پردے کی پابندی موجود ہے۔

یہ کتاب اب سے بہت پہلے لکھی جانا چاہیے تھی۔ کیونکہ ہم دونوں اس کتاب کے موضوع سے ایک عرصہ سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے کام اور خاندان کی مصروفیتوں نے مسودہ کی تکمیل کو دشوار بنا دیا۔ اس کو مکمل کرنے کا ہمارا یہ فیصلہ اس تیز رفتار ابتری کا نتیجہ ہے جو دنیا میں بہت جگہ ثقافت اور مذہبی روایت کے حوالے سے عورتوں کے حقوق کے بارے میں پھیل رہی ہے۔ ایک دفعہ پھر عورتیں اس خوف اور خفگی کا نشانہ بن رہی ہیں جو سماجی حالات میں تیز رفتار تبدیلی کی وجہ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ رجعت پسند حکومتیں اور بااختیار سماجی تحریکیں دنیا کے بہت سے حصوں میں، ایک دفعہ پھر اس کوشش میں ہیں کہ عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق سلب کر لئے جائیں۔ یہ سب کچھ اس موہوم استحکام کی خاطر کیا جا رہا ہے جس کا تصور ایک دیومالائی ماضی سے وابستہ ہے۔

ہمارے کام کو اس جواب سے بھی بہت مدد ملی ہے، جو عورتوں پر اس تنقید کے ردعمل کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ایک تو عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جنوبی ایشیا میں، عورتوں کی

MashalBooks.org

انجمنوں کا جال بچھ گیا ہے اور دوسرے عورتوں کے مسئلے پر تحقیق اور عمل دونوں کی رفتار تیز تر ہوگئی ہے۔ ہم دونوں ان تمام کاموں میں فعال طور پر شریک رہی ہیں۔ ہمیں اس کتاب کے بارے میں تبادلہ خیالات کا موقعہ بھی ملا، اور مسودے پر اظہار خیال کا موقعہ بھی۔

یہ کتاب ایک طویل رفاقت کا بھی نتیجہ ہے۔ ان پچھلے پچیس سالوں میں کہ ہم نے اور ہمارے خاندانوں نے ایک دوسرے کو جانا ہے، ایک دوسرے کے وطن میں گھوما پھرا ہے۔ اور ہم دونوں نے مختلف معاشروں میں عورت ہونے کی سرخوشی، اور عورت ہونے کے مسئلہ پر جی کھول کر بات چیت کی ہے، پردے کا سوال ہم دونوں کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا۔ روشن جہاں کی بہن، رونق جہان نے جب ۱۹۶۰ء میں حنا پاپنیک کو اس افلاطونی کہانی کے بارے میں بتایا تھا تو اس وقت سے پردے کے کایا کلپ کی یہ کہانی، ہم دونوں کی بات چیت کا حصہ رہی۔

ان گزرتے سالوں میں، ہم پر دوستوں، خاندان اور رفقائے کار کی عنایتوں کا اتنا قرض چڑھ چکا ہے کہ اب ان سب کو یاد کرنا اسی طور ہوسکتا ہے کہ اعتراف تشکر کی ایک رسمی فہرست بنالی جائے۔

اپنے مضامین کے مسودوں پر اظہار رائے کے لئے ہم، ڈاکٹر انیس الزماں، پروفیسر شعبہ بنگالی ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈاکٹر رفعت حسن پروفیسر اور صدر ریلیجس سٹڈیز پروگرام لونیویل یورنیورسٹی، ڈاکٹر ملاویکا کارلیکر سنٹر فار ڈویلپمنٹ سٹڈیز نئی دہلی اور ڈاکٹر بروس پرے ڈیپارٹمنٹ آف ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیئن سٹڈیز یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے ممنون ہیں۔

بہت ساری وجوہات کی بناء پر، ہم حمیدہ خالہ کے بے حد ممنون ہیں اور ان کے گھر والوں کے بھی کہ انہوں نے اس طرح کھل کر پردے میں گزرنے والی زندگی کے متعلق بات چیت کی۔ ہم ایلا بھٹ، جنرل سیکرٹری، سیوا احمد آباد کے بھی بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں یونین آرگنائزر والی کہانی سنائی۔

ہم بنگلہ اکادمی، ڈھاکہ کے بھی بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ''سلطانہ کا خواب'' اور

''رقیہ رچناولی'' رقیہ کی تحریروں کا مجموعہ، سے دوسرے اقتباسات شائع کرنے کی اجازت دی۔ یہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں شائع کی تھی۔ ہم ڈھاکہ کے ایک ریسرچ گروپ ''وومن فار وومن'' کے بھی ممنون ہیں کہ جن کی معاونت سے روشن جہان نے ''عزلت نشینی میں: رقیہ سخاوت حسین کی اور درھ باسنی'' شائع کی۔ یہ رقیہ کے منتخب مضامین کے ترجموں پر مشتمل ہے۔

ہم بنگلہ دیشی آرٹسٹ ثریا رحمان کے بھی شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے کشیدہ کاری کا لحاف (نقشی کنتھا) ڈیزائن کیا۔ جس کا ایک حصہ کتاب کے کور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور اس گمنام بنگالی عورت کے بھی، جس نے سلائی کا سارا کام کیا۔ حنا پاپنیک، جو کشیدے کے اس کام کی مالک ہیں، انہوں نے کتاب کی جلد کے لئے اس کی تصویریں کھینچیں۔

رقیہ اور پردے پر اپنے کام کے دوران میں ہم دونوں کو سارے اداکاروں کا تعاون میسر رہا۔ جس نے اس موجودہ کتاب کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ فورڈ فاؤنڈیشن (ڈھاکہ) کے ایک وظیفہ پر روشن جہان نے رقیہ کی تنقیدی سوانح پر، وزیٹنگ اسکالر کی حیثیت سے سنٹر فار ایشیئن ڈویلپمنٹ سٹڈیز، بوسٹن یونیورسٹی میں کام کیا۔ حنا پاپنیک کو ان کی تحقیق جو جنوبی ایشیا میں صنفی عزلت اور عورتوں کی علیحدگی کے متعلق تھی اسے نیشنل ایڈاؤمنٹ فار دی ہیومینیٹیز سے گرانٹ ملی۔

بین الاقوامی سطح پر انتظامی دشواریوں کے باوجود ہم ان تمام اداروں کے شکر گزار ہیں، جو اس سارے فاصلے کے باوجود ہمیں ورکشاپ اور مطالعاتی دوروں کے لئے سہولت مہیا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم تعلق یونائیٹڈ نیشن یونیورسٹی (ٹوکیو) کمپریٹو سٹڈی آف دومنز ورک اینڈ فیملی سٹریٹیجی ان ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا ہے جس میں ہم دونوں سرگرم طور پر شریک رہے۔ اسمتھسونین انسٹی ٹیوٹ اور امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین سٹڈیز کی حنا پاپنیک کے لئے، ایک اور تحقیق کے سلسلے میں مالی امداد بھی ہماری سپاس گزاری کی مستحق ہے۔

اور سب سے آخر میں ہم فلورنس ہاؤ، سوسنا ڈرائیور اور فیمینسٹ پریس کے عملے کے بے حد شکر گزار ہیں۔ انہوں نے جس صبر اور تعاون کا اس سارے وقت میں مظاہرہ کیا، جو ایک

دوسرے سے آدھی دنیا کے فاصلے پر رہنے والی، دو لکھنے والیوں سے حتمی مسودہ حاصل کرنے کے لئے درکار تھا۔

روشن جہاں بنگلہ دیش

حنا پاپنیک یو ایس اے

MashalBooks.org

روشن جہاں

سلطانہ کا خواب: پردے کی کایا کلپ

۱۹۰۵ء میں مدراس سے چھپنے والے ایک انگریزی رسالے The Indian Ladies Magazine میں ''سلطانہ کا خواب'' پہلی بار چھپا۔ ایک خاتون مصنف کی لکھی ہوئی، یہ پہلی افلاطونی کہانی ہے جسے شعوری طور پر نسائی مفادات کی خاطر لکھا گیا۔ یہ کہانی بلاشبہ ایک ہندوستانی خاتون کے قلم سے لکھی پہلی کہانی ہے۔ اس کی مصنفہ رقیہ سخاوت حسین (۱۹۳۲۔۱۸۸۰) بلاشبہ بنگال کی پہلی نسائیت کی علمبردار خاتون ہیں جنھوں نے عورتوں کی خاطر آواز اٹھائی۔ ذرا سی دیر کو یہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ ایک ایسی اصطلاح کا استعمال کیونکر نہ کیا جائے جو اپنے سیاق سے جڑی ہوئی ہے۔ ''نسائیت'' کی اصطلاح کے معنی مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہیں۔ لیکن پھر بھی یہی وہ اصطلاح ہے جو رقیہ کی تحریروں کو پڑھنے والے اب استعمال کرتے ہیں۔ جس وقت یہ کہانی چھپی ہے اس وقت تک رقیہ ایک مضمون نگار کی حیثیت سے پہچانی جا چکی تھیں۔ انہوں نے بنگالی زبان میں عورتوں کی زندگی کے جبر اور کم تر حیثیت کے متعلق لکھا اور خاص طور پر بنگال کی مسلمان عورتوں کے بارے میں۔

اس کہانی کے چھپنے کے بیس سال بعد ۱۹۳۰ء میں رقیہ کو اس کہانی کا لکھنا یاد آیا۔ جس وقت انہیں اس کا خیال آیا وہ اپنے گھر میں تنہا تھیں کیونکہ ان کے شوہر، خان بہادر سید سخاوت حسین، ڈپٹی مجسٹریٹ اپنے معائناتی دورے پر تھے۔ ضلع بھاگلپور کے ایک چھوٹے سے شہر بکا میں وہ تعینات تھے۔ یہ آج کے بھارت کے صوبہ بہار میں ہے۔ یہ نوجوان بنگالی خاتون خود کو اس

MashalBooks.org

گھرانے میں تنہا محسوس کرتی ہوگی جہاں سارا خاندان اردو بولتا تھا۔ رقیہ اردو بول سکتی تھیں لیکن بنگالی ان کی اپنی زبان تھی۔ ''وقت گزارنے کو میں نے کہانی لکھ ڈالی۔'' اس کہانی کے لکھنے کی تحریک میں ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے غیر بنگالی شوہر کو، اپنی انگریزی کی مہارت دکھانا چاہتی تھیں کیونکہ وہی تھے جنہوں نے انگریزی لکھنے پڑھنے کے لئے ان کی ہمت بندھائی تھی۔ وہی ان کے سب سے پہلے، اور معترف سامع بھی تھے۔ دوسری وجہ شاید ہو کہ وہ مضمون کے علاوہ بھی کسی صنف میں لکھنے کی اپنی قابلیت جانچنا چاہتی تھیں۔

جب سخاوت واپس آئے، تو انہوں نے ویسا ہی کیا، جیسی رقیہ کو توقع تھی۔ انہوں نے یوں ہی سرسری طور پر پوچھا کہ وہ اتنے دن کیا کرتی رہیں۔ ''میں نے جب انہیں مسودہ دکھایا'' تو انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پورا پڑھ ڈالا۔ ''ایسا ظالم انتقام'' انہوں نے کہانی ختم کر کے کہا۔ وہ کہانی سے متاثر ہوئے۔ اس میں ایسے اچنبھے کی بھی کوئی بات نہیں۔ اور اپنے دوست مسٹر میکفرسن، کمشنر بھاگلپور، کو یہ کہانی بھجوائی کہ وہ اس پر اپنی رائے دیں۔ کسی بھی نئے لکھنے والے کی طرح رقیہ کے لئے یہ بات بڑے اطمینان کی تھی کہ انہوں نے بھی کہانی کے متعلق توصیفی رائے دی تھی۔ میرے شوہر کے نام خط میں انہوں نے لکھا' ''جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے' وہ بے حد دل کش ہیں۔ اپنی نوعیت میں انوکھے، اور انتہائی درست انگریزی میں ان پر اظہار کیا گیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ ہم مستقبل میں کس طرح فضائی سفر کر سکیں گے۔ ان کے مشورے یہاں بالکل نئی اپچ لئے ہوئے ہیں۔'' ایسی رایوں کے مدنظر سخاوت نے کسی طرح رقیہ کو منالیا کہ وہ اس کہانی کو The Indian Ladies Magazine میں چھپنے کے لئے بھیجیں۔ جس نے اسے ۱۹۰۵ء میں چھاپ دیا۔ ۱۹۰۸ء تک مصنف کی حیثیت سے رقیہ میں اتنا اعتماد آ گیا تھا کہ وہ ''سلطانہ کے خواب'' کو کتاب کی صورت میں چھاپنے کا سوچ سکیں۔ اسی سال ایس کے لاہری اور کمپنی نے کلکتہ سے اس کتاب کو شائع کیا۔

یہ بات بھی حیران کن نہیں ہونا چاہیے کہ ''سلطانہ کے خواب کے لئے'' اکثر لوگوں کا

ردعمل ایک شیریں خواب کا سا ہے اور وہ اسے جابر شوہروں کے خلاف ''ظالم انتقام'' نہیں سمجھتے، جیسا کہ رقیہ کے باشعور اور حساس شوہر کا خیال تھا۔ ایسے لوگ جنہیں شکر میں لپٹے ان تلخ حقائق کا ادراک تھا، انہوں نے بھی اس کو رقیہ کے مضامین میں غیر مخفی طنز کی نشتریت اور چھبتی ہوئی بذلہ سنجی کے بعد تسلیم کیا تھا۔ ابوالحسین جیسے نقادوں نے سوئفٹ کے گلیورز ٹریولز سے اس کی مماثلت تلاش کی۔ یہ کتاب خود رقیہ کو بے حد پسند تھی اور انہوں نے اپنے مضامین بھی اس کا کئی بار حوالہ دیا۔ عورتوں کی مملکت میں مردوں کا انتہا درجہ کی علیحدگی کا شکار کر دینا اس جبر اور کمزوری کے خلاف ردعمل تھا، جو ہمارے یہاں عورتوں کا مقدر ہے۔ شاید مسز آر۔ ایس حسین نے کمزور بنگالی عورتوں میں اعتماد پیدا کرنے کی خاطر ایسا کیا کہ عورتوں میں بھی مردوں کے مساوی یا ان سے زیادہ صلاحتیں اور قابلیت پیدا ہو سکے۔ شاید وہ خود کو اس قدر ترقی یافتہ کرسکیں، جہاں انہیں فطرت پر مکمل دسترس حاصل ہو جائے اور مردوں کی مدد کی ضرورت نہ رہے۔ وہ اپنے لئے ایک ایسی دنیا تخلیق کرسکیں، جہاں حسن، فراوانی اور خیر ہو۔ ''سلطانہ کا خواب'' اسی کی غمازی کرتا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ''سلطانہ کا خواب'' کے مرد قاری اپنے گھر کی عورتوں کو ادراک ذات کی تحریک دینے کی کوشش کریں گے۔''

یقیناً رقیہ کی زندگی کی مہم یہی تھی۔ مسلمان بنگالی عورتوں کو اپنی ذات کا شعور پیدا کرنے کے لئے محرک کرنا اور معاشرے کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ اس راہ میں رکاوٹیں نہ کھڑی کرے۔ ''سلطانہ کا خواب'' بہت سی کہانیوں میں سے ایسی کہانی ہے، جس سے رقیہ نے زندگی بھر معاشرے کے بنیادی رویوں کے خلاف غیر متناہی جہاد جاری رکھا۔ عورتوں کے حقوق کی علمبردار ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اپنے قلم کو انتہائی مہارت سے استعمال کیا۔ مخالفوں کی کمزوریوں پر گرفت کے لئے ان کا مشاہدہ بے خطا تھا۔ ان کی حس مزاح بھی خوب تھی اور اس سے ان کے دعوؤں کی تقویت ملتی تھی۔ ان کا اسلوب بے حد جاندار اور ظریفانہ ہے، لیکن ان کی تحریروں کا بنیادی مقصد لطف انگیزی نہیں تھا۔ (بنگلہ دیش کے اسکولوں کے بچے رقیہ کے آج بھی ممنون ہیں کہ اپنے

مرد ہم عصروں کی طرح انہوں نے روکھے پھیکے مضامین نہیں لکھے) ان کا اسلوب تو موجودہ نظام پر سنجیدہ سوال اٹھاتا ہے، جو بظاہر حقیقت معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق گمان پیدا کرتا ہے اور ان کے خیال میں جو کچھ شر اور بے انصافی ہے اس کے خلاف تبدیلی پر لوگوں کو آمادہ کرتا ہے۔

تبدیلی کی یہی مہم وہ وجہ ہوگی جس کی وجہ سے رقیہ نے انگریزی میں لکھنا اور شائع ہونا جاری نہیں رکھا۔ حالانکہ اپنی انگریزی تحریر کے متعلق انہیں اپنے علم عصروں سے بہت تحسین ملی۔ ان کا قلم تو معاشرتی اصلاح کے لئے ایک ہتھیار تھا۔ ان کا بنیادی خیال تو یہ تھا کہ وہ اپنے طبقہ کے مسلم بنگال کے مرد اور عورتوں دونوں کے شعور کو بیدار کریں۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنی ہی زبان سب سے بہتر وسیلہ تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلوب اور طرز تحریر کے بارے میں بہت محتاط بھی تھیں۔ اور اپنے لفظوں سے، اپنا مقصد پوری طرح حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جن زبانوں سے وہ واقف تھیں، انگریزی اس میں پانچویں تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ احساس ہو کہ اپنی تخلیق و تصنیف کے لئے انگریزی محاورہ ان کے فطری جوہر سے میل نہیں کھاتا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، رقیہ نے کبھی اس پر اظہار خیال نہیں کیا، لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ انگریزی کو انہوں نے جب ہی استعمال کیا جب کوئی مجبوری آن پڑی۔

''سلطانہ کا خواب'' ایک افلاطونی تحریر ہے اور اس میں طنز و مزاح کی کاٹ خوب ہے۔ ہندوستانی پس منظر ہونے پر کوئی مغالطہ نہیں۔ مثال کے طور پر سسٹر سارہ اور سلطانہ کے مکالمہ میں ''تذکیر و تانیث'' کے ہندوستانی تصورات موجود ہیں۔ سلطانہ ہندوستانی معاشرے کی مخصوص نمائندہ ہے اور سسٹر سارہ باہر کی دنیا کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ مصنف کی ہم زاد بھی ہے۔ سلطانہ کے ذریعے سے رقیہ نے ہندوستانی رسوم و رواج کا مضحکہ اڑایا ہے۔

عورتوں کی مملکت میں، خواتین طاقت ور ہیں۔ رقیہ نے اس بات کو ضروری نہیں جانا کہ شدید تبدیلی کی خاطر، وہ مردوں کے وجود کو یکسر ہی مٹا ڈالیں۔ جس طرح شارلٹ پرکنز گل مین نے چند سال پہلے اپنی تصنیف ''ہرلینڈ'' میں کیا تھا۔ اور ایسے معاشرے کی تصویر پیش کی تھی جو